© rasailojaraid.com

ڈاکٹر محمد ریاض

ارمغانِ حجاز

"ارمغان" آن گلشن خوش رنگ و بو   بیدلان را می کشد سوی چمن

ارمغانِ حجاز، اقبال کے اردو اور فارسی کلام کا آخری مجموعہ ہے جو ۱۹۳۸ء میں ان کی وفات کے چند ماہ بعد شائع ہوا۔ کتاب کے متن اور علامہ مغفور کی بعض دیگر تحریروں کی تصریح کے مطابق کتاب ۱۹۳۶ تا ۱۹۳۸ء کے ابتدائی مہینوں میں تکمیل پذیر ہوئی۔ اقبال کا یہ دو سالہ کلام جو کم و بیش ہزار ابیات کا حامل ہے، ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ کتاب کا دو تہائی حصہ فارسی دوبیتیوں کی صورت میں ہے۔ اردو کلام مختلف اصنافِ سخن کے لباس میں ہے اور پوری کتاب کا تقریباً ایک تہائی ہے ظاہری اسلوب کے لحاظ سے کتاب کے بارے میں چند امور توجہ طلب ہیں۔

پورا فارسی حصہ باباطاہر ہمدانی (پانچویں صدی ہجری کے شاعر) کی فہلویات کے اسلوب میں دوبیتیوں کی صورت میں ہے۔ ایسی چند دوبیتیاں اردو حصے میں بھی ہیں۔ اس سے قبل اقبال پیامِ مشرق اور بالِ جبریل میں بالترتیب ایسی فارسی اور اردو دوبیتیاں لکھ چکے تھے۔ یہاں بھی وہی وزن رکھا گیا۔ (مفاعیلن، مفاعیلن، مفاعیل یا فعولن) اور بیت اول کہیں مردّف اور مقفّیٰ ہے اور کہیں غیر مردّف اور غیر مقفّیٰ۔ باباطاہر اور دیگر دوبیتی سرا فارسی شاعر صرف تیسرے شعر کو قافیہ یا ردیف کے بغیر لاتے رہے، مگر اقبال نے اس پابندی کو ہر جگہ قبول نہیں کیا ہے:

سحر می گفت بلبل باغباں را   دریں گِل جز نہالِ غم نگیرد
بہ پیری می رسد خارِ بیاباں   ولے گُل چوں جواں گردد بمیرد   (پیامِ مشرق)

مریدی فاقہ مستی گفت با شیخ   کہ یزداں را ز حالِ ما خبر نیست
بہ ما نزدیک تر از شہ رگِ ماست   ولیکن از شکم نزدیک تر نیست   (ارمغانِ حجاز حضورِ حق)

لہ ملک الشعرا ڈاکٹر قاسم رسا، ایران

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تمیزِ خار و گل سے آشکارا نسیمِ صبح کی روشن ضمیری
حفاظت پھول کی ممکن نہیں ہے اگر کانٹے میں ہو خوئے حریری

اردو حصے میں دوبیتیوں کے علاوہ قطعے اور نظمیں ہیں۔ مختصر نظموں کے سوا اس حصے میں ابلیس کی مجلسِ شوریٰ، عالمِ برزخ اور ملّا زادہ ضیغم لولابی کشمیری کے عنوانات سے طویل نظمیں موجود ہیں۔ ہیں۔ یہ نظمیں اس حقیقت کی غماز ہیں کہ بیماری کی نقاہت اور دورِ پیری میں بھی اقبال کی فکری و فنی توانائیاں انحطاط پذیر نہ ہوئی تھیں۔ بلکہ اس کتاب میں ان کے فن کا ارتقا اور فکر کی مزید بلندی و گہرائی جلوہ گر ہے۔

ارمغانِ حجاز کی اکثر فارسی دوبیتیاں مسلسل و مربوط معانی پر مشتمل ہیں۔ اس لحاظ سے وہ قطعے بھی کہے جاسکتے ہیں۔ پیامِ مشرق اور بالِ جبریل کی دوبیتیاں اس کے برعکس رباعیات، کہی جاسکتی ہیں۔ گو ان کا وزن رباعی کا نہیں، مگر معانی مستقل نوعیت کے ہیں۔ دراصل آخری عمر میں اقبال حج اور حرمین شریفین کی زیارت کی غرض سے سفر کرنے کے انتہائی آرزومند تھے۔ ان کی طویل بیماری اس سفر میں حارج ہوئی، مگر ان کے جذبات و تخیلات کا نقش صفحۂ قرطاس پر منتقل ہو کر اہلِ عالم کے لیے ارمغان بن گیا۔ ظاہری اسلوب کے ان پہلوؤں سے گزر کر جب کتاب کے معنوی حصے کی طرف آئیں تو اس میں ایک جہانِ معانی نظر آتا ہے۔ یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ جو کچھ دوسری کتابوں میں اقبال نے بالتفصیل کہا ہے، وہ 'ارمغانِ حجاز' میں بالاجمال موجود ہے۔ کتاب کے فارسی حصے کی پانچ فصلیں ہیں اور ان فصلوں کے ذیلی عنوانات کی تعداد ۶۳ ہے۔ اردو حصے کے عنوانات اس پر مزید ہیں۔ کتاب کی معنی خیزی اور عمق کی چند جھلکیاں تو بعد میں دیکھی جاسکیں گی۔ سردست اتنا کہہ دوں کہ اقبال کے کئی اہم افکار صرف اسی کتاب میں بیان ہوئے ہیں۔

کتاب کا نام

جیسا کہ اوپر اشارہ ہوا، اس کتاب کا معتد بہ حصہ شاعر نے گویا سرزمینِ مقدس حجاز کے خیالی سفر میں لکھا ہے۔ کتاب کا نام 'ارمغانِ حجاز' بھی اسی مناسبت سے ہے: یعنی عالمِ خیال کے حجازی سفر کا ہدیہ۔ یہ ہدیہ مسلمانوں کے لیے مخصوص نہیں بلکہ عالمِ انسانی کے لیے شاعر نے رحمۃ اللعالمینؐ کے پیغام کا انعکاس پیش کیا ہے۔ بہرصورت یہ بات قابلِ غور ہے کہ کتاب کا صرف فارسی حصہ 'ارمغانِ حجاز'

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے۔ اُردو حصّے کو ایک بے عنوان ضمیمہ جانا چاہیے۔ اُردو حصّے کے پیغامِ اسلامی سے کیسے یا رائے انکار ہے؟ مگر اس میں "حجاز" اور اس کی مناسبات کی کوئی ترکیب استعمال نہیں ہوئی۔ فارسی حصّے میں "حجازی" نسبتوں کا استعمال بھی "ارمغانِ حجاز" کے حسنِ تسمیہ کا مظہر ہے:

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید؟ ‏ نسیمے از حجاز آید کہ ناید؟
سر آمد روزگارِ این فقیرے ‏ دگر دانائے راز آید کہ ناید؟[1]

گنا و عشق و مستی عام کردند ‏ دلیلِ پختگاں را خام کردند
بآہنگِ حجازی می سرایم ‏ نخستین بادہ کاندر جام کردند[2]

دلِ مُلّا گرفتارِ غمی نیست ‏ نگاہی ہست در چشمش نمی نیست[3]
از اں بگریختم از مکتبِ او ‏ کہ در ریگِ حجازش زمزمی نیست

تو سلطانِ حجازی[4] من فقیرم ‏ ولے در کشورِ معنی امیرم
جہانی کو ز تخمِ لا الٰہ ہست ‏ بیا، بنگر بآغوشِ ضمیرم

حضورِ حق

شاعرِ مومن، حج کی نیت سے عالمِ خیال میں، خدا کے گھر جا پہنچتا ہے۔ اُسے اپنے معمولی زادِ راہ کے ختم ہو جانے یا کسی ہمدم و دلسوز کے نہ ملنے کی پرواہ نہیں۔ اس حصے کا سرنامہ درج ذیل دوبیتی ہے۔ دردمند شاعر کی سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ اس کے کلام کی تاثیر سے مسلمانوں کا دورِ غلامی خاتمہ پذیر ہو:

خوش آں راہی کہ سامانے نگیرد ‏ دلِ او بہ ہمرہ یاراں کم پذیرد
بہ آہی سوزناکش سینہ بکشای ‏ زیک آہش غمِ صد سالہ میرد[5]

---

1. مصرع از عراقی
2. کلیاتِ اقبال فارسی (لاہور، ۱۹۷۳ء) میں غلطی سے غمی چھپ گیا ہے۔
4. خطاب بہ ملک عبدالعزیز
5. اقبال نے ضرورتِ شعری کے طور پر مسلمانوں کے دورِ انحطاط کو اپنے اُردو اور فارسی اشعار میں ۱۰۰، ۲۰۰، ۱۳۰۰ اور ۳۰۰۰ سال لکھا ہے۔ (بالِ جبریل، ارمغانِ حجاز)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"شکوہ" کے مصنف کو اب بھی خدائے تعالیٰ سے شکایت ہے کہ اپنے حقیقی نام لیواؤں کے دورِ انحطاط کا خاتمہ نہیں فرماتا۔ مسلمانوں کو اپنے دوسرے بھائیوں سے ہمدردی نہیں رہی اور "بے مہری خدا" کے نتیجے میں وہ "وطن پرستی" کی محدود دنیا میں رہنے لگے ہیں۔

نگاہِ تو عتاب آلود تا چند؟ — بتانِ حاضر و موجود تا چند؟
درین بت خانہ اولادِ براہیم — نمک پروردۂ نمرود تا چند؟
چہ گویم قصۂ دین و وطن را — کہ نتواں فاش گفتن این سخن را
مرنج از من کہ از بے مہری تو — بنا کردم ہماں دیرِ کہن را

اسے مسلمانوں کی بدحالی پر ہی دکھ نہیں، وہ تمام دنیا کے محکوم، مفلوک الحال اور مظلوم انسانوں کی حالتِ بد پر خون کے آنسو بہاتا ہے۔ وہ عالمِ خیال میں ایک مستجاب الدعا مقام پر آیا ہوا ہے اس لیے خدا سے دعا کرتا ہے کہ مزدوروں، غریبوں اور غلاموں کی بدحالی کو خوشحالی سے بدلنے کے وسائل فراہم کرے:

جہانی تیرہ تر با آفتابے — صوابِ او سراپا ناصوابے
ندانم تا کجا ویرانہ را — دہی از خونِ آدم رنگ و آبے
جہان تست در دست خسے چند — کسانِ آن بہ بند نا کسے چند
ہنرور در میانِ کارگاہان — کشد خود را بہ عیش کرگسی چند

برصغیر ہند و پاکستان کے مسلمان اور دیگر اقوام، اقبال کی خصوصی توجہ کے تحت رہے ہیں۔ ہو نہیں سکتا کہ بیت اللہ کی خیالی مناجات میں شاعر انھیں فراموش کر دے۔ وہ ان معنوی نقصانات یعنی بے دینی، بے یقینی اور بے عملی کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن سے انگریزی عملداری نے مسلمانوں کو دوچار کر رکھا ہے:

دگرگون کشورِ ہندوستان است — دگرگوں آں زمین و آسمان است
مجو از ما نمازِ پنجگانہ — غلاماں را صفِ آرائی گران است
ز محکومی مسلماں خود فروش است — گرفتارِ طلسمِ چشم و گوش است
ز محکومی رگاں در تن چناں سست — کہ ما را شرع و آئیں بارِ دوش است

"شاعرِ مشرق" کو مسلمانوں کی مجموعی بے عملی نے اس قدر دلگیر کر رکھا ہے کہ وہ "حضورِ حق" ان کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بہتری کی دعا کرتے ہوئے ندامت محسوس کرتے ہیں۔[۵۶] جاوید نامہ کی مناجات میں انھوں نے معاصر عمر رسیدہ نسل سے اظہار نومیدی کرتے ہوئے نوجوانوں سے کچھ توقعات وابستہ کی تھیں اور یہ خدشہ بھی ظاہر کیا تھا کہ اگر موجودہ بے عملی کو مسلمانوں نے ترک نہ کیا، تو اپنے تغیر ناپذیر قوانین کے مطابق خدا تعالیٰ ممکن ہے انھیں کسی بہتر عمل والی قوم سے بدل دے۔[۵۷] یہاں بھی وہ مجبوراً یہی کہتے نظر آتے ہیں کہ مسلمانوں کے نام سے "ننگِ مسلمانی" کے مصداق افراد اگر دنیا سے مٹ جائیں اور ان کی جگہ ایک بہتر ملتِ مسلمہ ابھرے، تو کوئی حرج نہیں ہے:

مسلمان فاقہ مست و ژندہ پوش است — ز کارش جبرئیل اندر خروش است
بیا نقشِ دگر ملت بریزیم — کہ ایں ملت جہاں را بار دوش است
دگر ملت کہ کارے پیش گیرد — دگر ملت کہ نوش از نیش گیرد
نگردد با یکے عالم رضامند — دو عالم را بہ دوش خویش گیرد
دگر قومی کہ ذکر لا الٰہش — بر آرد از دلِ شب صبح گاہش
شناسد منزلش را آفتابے — کہ ریگ کہکشاں روید ز راہش

یہ امر توجہ طلب ہے کہ "حضورِ حق" شاعر نے اپنے لیے کیا دعا کی؟ یہی کہ اس کے کلام کی تاثیر بڑھے اور اس سے عام انسانوں کی زندگی بہتر بنے۔ اس کی عبادت کے خلوص سے کائنات وجد میں آئے اور اسے سنائی کا سا صدق و اخلاص، رومی کا شور و ہنگامہ اور امیر خسرو کے کلام کا سوز نصیب ہو۔ اقبال کو شاعری کے اصلاحی پہلو پر بے حد یقین تھا۔ اسی لیے وہ دعا کرتے ہیں کہ اگر ان کے بعد کوئی دوسرا "دانائے راز" آئے، تو وہ بھی "حکیم نے نواز" (فلسفی شاعر) ہی ہوگا۔

زمن ہنگامۂ دہ ایں جہاں را — دگرگوں کن زمین و آسماں را
ز خاکِ ما دگر آدم برانگیز — بکش ایں بندۂ سود و زیاں را
عطا کن شورِ رومی، سوزِ خسرو — عطا کن صدق و اخلاصِ سنائی[۵۸]

---

۵۶ بہ آں قومم از تو می خواہم کشادے — فقیہش بے یقینے، کم سوادے
۵۷ قرآنِ مجید، ۴۷ : ۳۸ (اقبال کے بیان کے لیے دیکھیے جاوید نامے کا فلک عطارد)
۵۸ سنائی، [illegible] خسرو کی شاعری کی اہم خصوصیات [illegible]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اگر می آید آں دانائے رازے
بدہ او را نوائے دل گدازے
ضمیرِ امتاں را می کند پاک
کلیمے یا حکیمے نے نوازے

اس عاشقِ رسولؐ کی ذاتی دعا اسی قدر ہے کہ قیامت کے دن اس کا حساب حضورِ پاک کی نظروں سے اوجھل لیا جائے۔ اس مخلصانہ التماس کے بعد بطحا کا خیالی مسافر، یثرب کی راہ لیتا ہے:

بہ پایاں چوں رسد ایں عالمِ پیر
شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر
مکن رسوا حضورِ خواجہؐ ما را
حسابِ من ز چشمِ اُو نہاں گیر

حضورِ رسالت مآبؐ

اقبال نے یہاں سرنامے پر گیارھویں صدی ہجری کے ایک کم معروف شاعر، عزت بخاری کا نعتیہ شعر درج کر کے قارئین کو جنابِ رسالت مآبؐ کے آداب کی طرف متوجہ کیا ہے:

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ اینجا

"ارمغانِ حجاز" کا یہ حصہ بے حد و حساب عشق پرور، ایمان افروز اور رقت بار ہے۔ عشقِ رسولؐ کی ادنیٰ رمق رکھنے والا شخص اُسے پڑھتے ہوئے روئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جاوید نامہ میں اقبال نے کہا تھا کہ خدا کا انکار کرنے والا بھی نبی کی شان سے انکار نہیں کر سکتا[۵۹]۔ اس انسانِ کاملؐ کو لاکھوں نے دیکھا اور ہزاروں نے اس کے مناقب اور مکارمِ اخلاق جمع کیے ہیں۔

شاعر نے رقت بار انداز میں مدینۃ الرسولؐ کی طرف اپنے ساحرانہ جذبات کا اظہار کیا ہے۔ وہی عاشقِ رسولؐ نہیں، اس کی ناقہ بھی عاشقِ رسولؐ ہے۔ روضۂ رسولؐ پر حاضری کے اشتیاق نے اُسے اپنی بیماری اور نقاہت بھلا دی ہے۔ وہ کاروانِ عرب میں شریک ہے۔ اُسے اپنی 'بدآہنگی' پر ندامت نہیں۔ آخر وہ عرب تو نہیں اور نہ عربی اس کی زبان ہے۔ مگر حدی خوانی میں وہ کسی سے پیچھے نہیں۔ شعر وہ فارسی کے بھی پڑھ لیتا ہے مگر عجمیت سے متنفر ہے۔ محبوبِ حجازی سے دل لگانے والے خوش قسمتوں کی معیت میں آخر کار وہ عالمِ خیال میں گنبدِ خضرا کے سامنے سر خم کرتا ہے۔ اس تبرک سے ہم یہاں چند دوبیتیاں نقل کرتے ہیں:

---

۵۹ می توانی منکرِ یزداں شدن۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بایں پیری رہِ یثرب گرفتم — نوا خواں از سرورِ عاشقانہ
چو آں مرغے کہ در صحرا سرِ شام — گشاید پر بہ فکرِ آشیانہ
سحر با ناقہ گفتم نرم تر رو — کہ راکب خستہ و بیمار و پیر است
قدم مستانہ زد چنداں کہ گوئی — بپایش ریگِ ایں صحرا حریر است
امیرِ کارواں آں اعجمی کیست — سرودِ او بآہنگِ عرب نیست
زند آں نغمہ کز سیرابیِ او — خنک دل در بیابانے تواں زیست
گہے شعرِ عراقی را بخوانم[1] — گہے جامی زند آتش بجانم
ندانم گرچہ آہنگِ عرب را — شریکِ نغمہ ہائے ساربانم
در آں دریا کہ او را ساحلے نیست — دلیلِ عاشقاں غیر از دلے نیست
تو فرمودی رہِ بطحا گرفتیم — وگرنہ جز تو ما را منزلے نیست
بگوئے تو گداز یک نفس بس — مرا ایں ابتدا، ایں انتہا بس
خراب جرأتِ آں رندِ پاکم — خدا را گفت ما را مصطفیٰ بس

آخری دو بیتیاں، شاعر کے رقت بار جذبات اور محبتِ رسولؐ کی مظہر ہیں۔ عالمِ تصوّر میں وہ گنبدِ خضرا کے سامنے سر بخاک ہیں۔ اتنے میں والیِ حرمین شریفین ملک عبدالعزیز آ نکلتے ہیں۔ مگر پیشتر اس کے کہ وہ اس "بدعت آمیز حرکت" پر معترض ہوں، شاعر خود بول اٹھتا ہے: "میں سجدہ نہیں کر رہا بلکہ پلکوں سے دوست کے دروازے کی گرد جھاڑ رہا ہوں":

تو ہم آں مے بگیر از ساغرِ دوست — کہ باشی تا ابد اندر برِ دوست
سجودی نیست اے عبدالعزیز ایں — بروبم از مژہ خاکِ درِ دوست

بلکہ اس ملاقات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ خادمِ حرمینِ شریفین کو چند سخنانِ حکمت بھی سنا دیتے ہیں:

---

[1] مثنوی رموزِ بیخودی میں اقبالؒ نے عراقی کے اشعارِ عاشقانہ کی حال آوری اور وجد آفرینی کو (مثلاً) مسلمانوں کے لیے غیر مفید بتایا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ترا اندر بیابانے مقام است — کہ شامش چوں سحر آئینہ فام است
بہر جائی کہ خواہی خیمہ گستر — طناب از دیگراں جستن حرام است

مسلمانیم و آزاد از مکانیم — بروں از حلقۂ نہ آسمانیم
بما آموختند آں سجدہ کز وے — بہائے ہر خداوندے بدانیم

ز افرنگی صنم بیگانہ تر شو[۱۱] — کہ پیمانش نمی ارزد بیک جو
نگاہی وام کن از چشمِ فاروقؓ — قدم بے باک نہ در عالمِ نو

حضورِ رسالتِ مآب میں بھی اقبال کی عرضداشت اجتماعی ہے۔ اس میں انفرادیت اتنی ہے کہ اپنے پیغام پر مسلمانوں کی بے توجہی کی وہ حضورِ مولاؐ شکایت کرتے ہیں۔ مسلمان عشقِ رسولؐ سے بہرہ ور نہیں۔ وہ نومید اور مایوس کن ہیں۔ برصغیر کے مسلمان غلامی پر قانع ہیں۔ ان میں کوئی تازہ نفس راہنما بھی نہیں۔ عرب اور عجم میں مسلمان استبدادی ملوکیت کی چکی کے پاٹ بنے ہوئے ہیں۔ ان کے صوفی و ملّا کوئی ایسی بات نہیں بتاتے جن سے مسلمانوں کی کایا پلٹے اور وہ سرفرازی کی زندگی گزار سکیں :

بہ آں رازی کہ گفتم پے نبردند — ز شاخِ نخلِ من، خرما نخوردند
من اے میرِ امم داد از تو خواہم — مرا یاراں غزل خوانے شمردند

دہانِ ما بجز دُودِ نفس نیست — بجز دستِ تو مارا دسترس نیست
دگر افسانۂ غم با کہ گویم — کہ اندر سینۂ غیر از تو کس نیست

شبی پیشِ خدا بگریستم زار — مسلمانان چرا خوارند و زارند؟
ندا آمد، نمی دانی کہ ایں قوم — دلے دارند و محبوبے ندارند

تب و تابِ دل از سوزِ غمِ تست — نوائے من ز تاثیرِ دمِ تست
بنالم زانکہ اندر کشورِ ہند — ندیدم بندۂ کو محرمِ تست

---

[۱۱] نیز دیکھیے مثنوی "پس چہ باید کرد" میں "حرفے چند با اُمتِ عربیہ" :

اے ز افسونِ فرنگی بے خبر — فتنہ ہا در آستینِ او نگر
تا عرب در حلقۂ دامش فتاد — آسماں یک دم اماں او را نداد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

هنوز این چرخ نیلی کج خرام است — هنوز این کاروان دور از مقام است
ز کار بی نظام او چه گویم — تو می دانی که ملت بے امام است
ملوکیت سراپا شیشه بازی است — از و ایمن نه رومی نے حجازی است
حضور تو غم یاران بگویم — با امیدے که وقتِ دلنوازی است

اقبال جناب رسالت مآبؐ سے التجا کرتے ہیں کہ اُن کے عشق و وصال کی شدت میں اضافہ ہو اور ان کے شعر کی تاثیر سے مسلمانوں کی کایا پلٹے، تاکہ وہ خود دار اور غیورانہ زندگی گزارنے لگیں:

نگویم از فروغ خالی که بگذشت — چه سود از شرح احوالے که بگذشت
چراغی داشتم در سینۂ خویش — فسرد اندر دو صد سالے که بگذشت
ز سوزِ این فقیرِ ره نشینے — بده او را ضمیرِ آتشینے
دلش را روشن و پاینده گردان — ز امیدے که زاید از یقینے

حضورِ ملت

"حضورِ ملت" والا حصہ بھی "حضور رسالت مآبؐ" والے حصے کی طرح خاصہ طویل ہے اور اس کے متعدد ذیلی عنوانات ہیں۔ ملتِ مسلمہ کے لیے اقبال کا پیغام یہ ہے کہ راہِ شریعت پر استحکام سے گامزن ہوں، اپنی خودی اور اس کی توانائیاں پہنچائیں۔ اپنی تقدیر کے آپ خالق بنیں۔ بے خودی پر عمل کرتے رہیں اور اجتماعی مفادات کو انفرادی استفادے پر ترجیح دیں۔ قرآنِ مجید کی تعلیمات پر خود غائر نگاہ ڈالیں اور صوفی و مُلّا کے فرسودہ افکار کو خاطر میں نہ لائیں۔ صوفی شعرا میں مولانائے روم کا کلام لائق مطالعہ ہے، اُسے پڑھنا چاہیے۔ ترکوں اور مصریوں کی بیداری سے اقبال خوش نظر آتے ہیں۔ ملتِ مسلمہ کے دیگر افراد کو بھی وہ دعوتِ بیداری دیتے ہیں۔ البتہ ترکوں کی تقلیدِ فرنگ کے وہ بدستور شاکی ہیں۔ مسلمان عورتوں کو اقبال مثنوی "رموزِ بیخودی" والا پیغام باندازِ دگر سناتے ہیں کہ حضرت فاطمۃ الزہرا کی زندگی کی پیروی کریں۔ اس حصے میں اقبال نے اپنے انقلاب آمد اور ترقی آفریں تعلیمی نظریات بھی پیش کیے ہیں۔ کچھ اشعار ملوکیت اور استعمار کی مذمت میں ہیں۔

چند دو بیتیاں ملاحظہ ہوں:

به منزل کوشش مانندِ مهِ نو — درین نیلی فضا هر دم فزون شو

© rasailojaraid.com

مقام خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق دل بند و راہ مصطفیٰؐ رو

مسلماں گر خودی مرد تمام است
بخاکش تا خودی میرد غلام است

اگر خود را متاعِ خویش دانی
نگہ را جز بخود بستن حرام است

خدا آں ملتی را سروری داد
کہ تقدیرش بدستِ خویش بنوشت

بہ آں ملت سروکارے ندارد
کہ دہقانش برائے دیگراں کشت

مریدی خود شناسے پختہ کارے
بہ پیرے گفت حرفے نیش دارے

بہ مرگِ ناتمامے جاں سپردن
گرفتن روزی از خاکِ مزارے

بہ کامِ خود دگر آں کہنہ مے ریز
کہ با جامش نیرزد ملکِ پرویز

ز اشعارِ جلال الدین رومی
بہ دیوارِ حریمِ دل بیاویز

بہ ترکاں بستہ درہا را کشادند
بنائے مصریاں محکم نہادند

تو ہم دستے بداماں خودی زن
کہ بے او ملک و دیں کس را ندادند

بحل ایں دختر کایں دلبری ہا
مسلماں را نزیبد کافری ہا

منہ دل بر جمالِ غازہ پرورد
بیاموز از نگہ غارت گری ہا

خدایا وقتِ آں درویش خوش باد
کہ دلہا از دمش چوں غنچہ بکشاد

بہ طفلِ مکتبِ ما ایں دعا گفت
پئے نانے بہ بندِ کس میفتاد

چو می بینی کہ رہزن کارواں کشت
چہ پرسی کاروانے را چساں کشت

مباش ایمن ازاں علمے کہ خوانی
کہ از وے روحِ قومے می تواں کشت

عرب خود را بنورِ مصطفیٰ سوخت
چراغِ مردۂ مشرق برافروخت

ولیکن آں خلافت راہ گم کرد
کہ اول مومناں را شاہی آموخت

ہنوز اندر جہاں آدم غلام است
نظامش خام و کارش ناتمام است

غلامِ فقرِ آں گیتی پناہم
کہ در دینش ملوکیت حرام است

حضورِ عالمِ انسانی، اقبال کا پیغام، سخت کوشی، تلقینِ یقین، خود شناسی اور تقدیر نیز ابلیس وغیرہ کے بارے میں نیا نقطۂ نظر اختیار کرنے کے لیے وقف ہے۔ ان امور کے اپنانے سے وہ خدا شناسی کی حقیقت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے از خود آگاہ ہونے لگیں گے۔

خوشا بختے کہ خود را باز گیری — ہمیں فقر است کو بخشد امیری
حیاتِ جاودان اندر یقین است — رہِ تخمین و ظن گیری، بمیری
سحر با در گریبانِ شبِ اوست — دو گیتی را فروغ از کوکبِ اوست
نشانِ مردِ حق دیگر چہ گویم [۱۲] — چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست
بہ رومی گفت با من راہب پیر — کہ دارم نکتہ، از من فرا گیر
کند ہر قوم پیدا مرگِ خود را — ترا تقدیر و ما را کشت تدبیر
ز فہمِ دون نہادان گرچہ دور است — ولی این نکتہ را گفتن ضرور است
بہ این نوزادہ ابلیساں نسازد — گنہگارے کہ طبعِ او غیور است

"بہ یارانِ طریق" (یعنی دوستوں سے خطاب) میں اقبال نے اپنے ہم نشینوں کو ان کی ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلائی ہے اور بعض نکات سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اقبال نے بعض جگہ اپنے احباب کی "رازدانی" سے خوشی کا اظہار کیا ہے، مگر یہاں وہ مجموعی طور پر اپنے یکہ و تنہا رہ جانے کا شکوہ کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ ظاہری طور پر کم آمیز نہ سہی، مگر باطناً منفرد اور یک رنگ ہی رہے ہیں:

چو رختِ خویش بر بستم ازیں خاک — ہمہ گفتند، با ما آشنا بود
و لیکن کس ندانست این مسافر — چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود؟

وہ احباب کو "آدابِ خودی" سکھاتے ہیں: خود فروشی سے جاہ و مرتبہ حاصل کرنا چہ معنی دارد؟ غلامی ایک لعنت ہے۔ کسی بادشاہ کے ہاں دستگیر بانے سے مردار خوار کوا بہتر ہے۔ امرا و سلاطین کے خوشامدی مسلمان، چہرۂ اسلام کا داغ ہیں۔ حقیقی اہلِ ہنر و فن وہ ہیں، جو بے نیازانہ زندگی گزاریں اور اپنی قدر دانی کے لیے صاحبانِ ثروت کے محلات کا طواف نہ کریں۔ یہاں علامہ مرحوم نے متنوع انداز سے "یارانِ طریق" کو غیورانہ زندگی گزارنے کا پیغام دیا ہے:

فقیرم ساز و سامانم نگاہی است — بچشمم کوہ یاران برگ کاہی است

---

[۱۲] یہ مصرع علامہ کے اس متن کے علی الرغم یوں مشہور ہو گیا ہے: نشانِ مردِ مومن با تو گویم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زمن گیر این کہ زاغ و زغن بہتر ۔۔۔۔ از آن بازے کہ دست آموز شاہی است
مسلمانی کہ داند رمز دیں را ۔۔۔۔ نساید پیش غیر اللہ جبیں را
اگر گردون بہ کام او نگردد ۔۔۔۔ بکام خود بگرداند زمیں را

آخر میں انھوں نے عاشقانہ عبادات اور عشقِ رسولؐ کی اہمیت کے بارے میں احباب کو متوجہ کیا ہے؛

چہ پرسی از نماز عاشقانہ ۔۔۔۔ رکوعش چوں سجودش محرمانہ
تب و تاب یکے اللہ اکبر ۔۔۔۔ نگنجد در نماز پنج گانہ
مسلمان را ہمیں عرفان و ادراک ۔۔۔۔ کہ بد[۴۳] خود فاش بیند رمز "لولاک"
خدا اندر قیاس ما نگنجد ۔۔۔۔ شناس آں را کہ گوید "ما عرفناک"

اُردو حصّہ

اس حصّے کا سر آغاز "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ"[۴۴] کے عنوان سے ایک معرکہ آرا اور خاصی طویل نظم ہے۔ اس سیاسی نظم کے بارے میں بہت لکھا گیا، اور ابھی مزید لکھنے کی گنجائش ہے مگر سردست یہاں اس پر اشارے کی گفتگو ہی ممکن ہے۔ یہ ابلیس اور اس کے پانچ مشیروں (شیاطین) کی گفتگو پر مشتمل ہے۔ ابلیس یہ کہتا دکھایا گیا ہے کہ یورپی طرز کا استبداد اور ملوکیت، دین کا عملی زندگی سے اخراج، ازلی تقدیر پر رضامندی اور نظامِ سرمایہ داری اس کے اپنے ہتھکنڈے اور کرتوت ہیں:

میں نے دکھلایا فرنگی کو ملوکیت کا خواب ۔۔۔۔ میں نے توڑا مسجد و دیر و کلیسا کا فسوں
میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا ۔۔۔۔ میں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں

پہلا مشیر، ابلیسی نظام کے کچھ مزید کارنامے بیان کرتا ہے۔ غلامی و امارت، صوفی و ملاّ کی استعمار پسندی، مسلمانوں کے علمِ کلام کی بے سود بحثیں، مسلمانوں کی عبادات میں روح و مغز کا فقدان اور جہاد کی منکر نئی نبوت کا ظہور، ابلیسی نظام کے کارنامے ہیں، اس کے علاوہ آمریت کی حامل نام نہاد جمہوریت

---

۴۳ دو احادیث کی طرف تلمیح ہے: لولاک لما خلقت الافلاک، ما عرفناک حق معرفتک و ما عبدناک حق عبادتک ... اقبال کا مدعا یہ ہے کہ متابعتِ رسولؐ سے ہی خدا شناسی کا امکان ہے۔
۴۴ دیکھیے سہ ماہی اقبال لاہور بابت اکتوبر ۱۹۶۹ء میں میرا مقالہ: اقبال کا تصورِ ابلیس۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یعنی ابلیس کی اصطلاح و لغت میں ملوکیت ہے۔ جہاں کہیں غریبوں کا استحصال و استیصال ہو رہا ہے، اس مقام کے نظام کو ملوکیت ہی کہا جائے گا:

اس میں کیا شک ہے کہ محکم ہے یہ ابلیسی نظام
پختہ تر اس سے ہوئے خوئے غلامی میں عوام
یہ ہماری سعیِ پیہم کی کرامت ہے کہ آج
صوفی و مُلّا ملوکیت کے بندے ہیں تمام
طبعِ مشرق کے لیے موزوں یہی افیون تھی
ورنہ 'قوالی' سے کچھ کمتر نہیں 'علمِ کلام'
ہے طواف و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا
کند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغِ بے نیام
کس کی نومیدی پہ حجت ہے یہ فرمانِ جدید؟
'ہے جہاد اس دور میں مردِ مسلماں پر حرام'
مجلسِ ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو
ہے وہ سلطاں، غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر

بحث و گفتگو کے دوران اشتراکی اور اسلامی معاشی نظاموں کے بارے میں بات ہوتی ہے۔ ابلیس اشتراکیت سے کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتا، البتہ حقیقی اسلامی معاشی نظام ابلیسی سلاسل کو کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔ ابلیس مشیروں کو کہتا ہے کہ مسلمانوں کو الٰہیات فروعی مسائل میں الجھائے رکھیں اور اصولِ دین سے انھیں دور رکھیں ورنہ نظامِ ابلیسی کی خیر نہیں۔

جانتا ہوں میں یہ امت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری، بندۂ مومن کا دیں
عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں
الحذر آئینِ پیغمبرؐ سے سو بار الحذر
حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں
موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لیے
نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیرِ رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں
چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب
یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں
خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام
چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات
ہے وہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر
جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات
ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات
مست رکھو، ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خدائے تعالیٰ مسلمانوں کو توفیق دے کہ وہ ابلیس اور اس کے مشیروں کی آرزوؤں کے مطابق کام نہ کریں۔ (آمین)

'عالمِ برزخ' کے عنوان سے ایک نظم میں غلامانہ زندگی کا استہزا کیا گیا ہے۔ ایک دوزخی یہ مناجات کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے کہ خدا کا شکر ہے دوزخ کے رہنے والے انگریزوں کے غلام نہیں ہیں :

اللہ ترا شکر کہ یہ خطۂ پرسوز   سوداگرِ یورپ کی غلامی سے ہے آزاد

ایک بوڑھا بلوچ بھی اپنے بیٹے کو 'خودی' اور 'بیخودی' کی تعلیم دیتا نظر آتا ہے کہ :

غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں   پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر   ہر فرد ہے ملّت کے مقدر کا ستارا

دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملّت   ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا

تقدیرِ امم کیا ہے؟ کوئی کہہ نہیں سکتا   مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارا

ارمغانِ حجاز حصہ اُردو میں ۱۶ فارسی شعر بھی شامل ہیں۔ اسی میں تین وہ معروف اشعار بھی ہیں جن میں مولانا حسین احمد مدنی مرحوم کے اس نظریے پر انتقاد کیا گیا کہ 'اقوام' اوطان سے وجود میں آتی ہیں ، 'ملّازادہ ضیغم لولابی کشمیری' ایک فرضی نام ہے۔ اس 'بیاض' کے تحت ۱۹ قطعے اور فردیات ملتے ہیں۔ جن میں کچھ فارسی ابیات بھی ہیں۔ اس نظم میں اقبال نے اہلِ کشمیر کی زبوں حالی کا نقشہ کھینچا اور انھیں پیغامِ بیداری دیا ہے۔ بعض ابیات میں غلامی کی مذمت اور آزادی کی مدحت کی گئی ہے۔ اس موازنے کے ذریعے اقبال برِصغیر کے غلام افراد کا خون گرمانے کی کوشش کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں :

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر   کل جسے اہلِ نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر

آہ یہ قومِ نجیب و چرب دست و تر دماغ !   ہے کہاں روزِ مکافات اے خدائے دیر گیر؟

ہر قوم کے افکار میں پیدا ہے تلاطم   مشرق میں ہے فردائے قیامت کی نمود آج

فطرت کے تقاضوں سے ہوا حشر پہ مجبور   وہ مُردہ کہ تھا بانگِ سرافیل کا محتاج

چہ بے پروا گذشتند از نوائے صبحگاہِ من   کہ بُرد آں شور و مستی از سیہ چشمانِ کشمیری؟

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا   کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں

کمالِ صدق و مروت ہے زندگی ان کی   معاف کرتی ہے فطرت بھی ان کی تقصیریں

© rasailojaraid.com

خودی سے مردِ خود آگاہ کا جمال و جلال — کہ یہ کتاب ہے، باقی تمام تفسیریں
شکوہِ عید کا منکر نہیں ہوں میں لیکن — قبولِ حق ہیں فقط مردِ حُر کی تکبیریں
غلام قوموں کے علم و عرفاں کی ہے یہی رمزِ آشکارا — زمیں اگر تنگ ہے تو کیا ہے فضائے گردوں ہے بے کرانہ
خبر نہیں کیا ہے نام اس کا خدا فریبی کہ خود فریبی — عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ

آخری قطعے میں اقبال نے حضرت میرزا مظہر جانجاناں (م ۱۱۹۵ھ) کے ایک شعر کو تضمین کیا ہے:

گلہ ہے مجھ کو زمانے کی کور ذوقی سے — سمجھتا ہے مری محنت کو محنتِ فرہاد[۱۵]
"صدائے تیشہ کہ بر سنگ می خورد دگر است — خبر بگیر کہ آوازِ تیشہ و جگر است"

ارمغانِ حجاز حصۂ اردو کی آخری نظم کا عنوان "حضرتِ انسان" ہے۔ یہ بالتصریح حضرت علامہ مرحوم و مغفور کی آخری اردو نظم ہے جو فروری ۱۹۳۸ء میں لکھی گئی ہے۔ اقبال رحمۃ اللہ علیہ عالمِ انسانی کی طرف سے مزید قدر دانی کے مستحق ہیں کیونکہ وہ آخری لمحات تک عظمت و شرفِ انسانی کے راگ الاپتے رہے ہیں:

جہاں میں دانش و بینش کی ہے کس درجہ ارزانی — کوئی شے چھپ نہیں سکتی کہ یہ عالم ہے نورانی
کوئی دیکھے تو ہے باریک فطرت کا حجاب اتنا — نمایاں ہیں فرشتوں کے تبسم ہائے پنہانی
یہ دنیا دعوتِ دیدار ہے فرزندِ آدم کو — کہ ہر مستور کو بخشا گیا ہے ذوقِ عریانی
یہی فرزندِ آدم ہے کہ جس کے اشکِ خونیں کو — کیا ہے حضرتِ یزداں نے دریاؤں کو طوفانی
فلک کو کیا خبر یہ خاکداں کس کا نشیمن ہے — غرض انجم سے ہے کس کے شبستاں کی نگہبانی

اگر مقصودِ کُل میں ہوں، تو مجھ سے ماورا کیا ہے؟
مرے ہنگامہ ہائے نو بہ نو کی انتہا کیا ہے؟

۱۵؎ ۱۹۳۱ء میں اقبال نے پیغامِ اقبال بہ ملتِ کوہسار کے عنوان سے ایک قطعہ شعر افغانستان بھیجا جو ماہنامہ کابل بابت جون ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے ۶ شعر ہیں۔ آخری شعر اقبال کے عندیے کو بہتر واضح کر دیتا ہے

یکے است ضربتِ اقبال و ضربتِ فرہاد — جز اینکہ تیشۂ ما را فسانہ بر جگر است